خطبات متعلق کارنامۂ حسینی و مجاہدۂ کربلا

آیۃ اللہ العظمیٰ سید العلماء سید علی نقی نقوی طاب ثراہ

حسین علیہ السلام اور اسلام

(وہ تقریر جو شب عاشورائے محرم ۱۳۷۵ھ پاکستان ریڈیو اسٹیشن لاہور سے نشر ہوئی)

سلام علیکم۔ یہ زمانہ وہ ہے جو حسینؑ کے ساتھ خصوصی نسبت رکھتا ہے جس میں گویا ہر درودیوار سے حسینؑ حسینؑ کی آواز سنائی دیتی ہے۔ اس لئے اس وقت "حسینؑ اور اسلام" کے عنوان کے ماتحت اس پر روشنی ڈالنا چاہتا ہوں کہ حسینؑ کا اسلام سے اور اسلام کا حسینؑ سے کیا خصوصی تعلق ہے اور حلقہ بگوشان اسلام کے لئے حسینی یادگار کے قیام ودوام کی کیا اہمیت ہے۔

حسینؑ اور اسلام کے باہمی ارتباط کے اظہار کے لئے سب سے پہلے مجھے جو الفاظ ملتے ہیں وہ یہ کہ حسینؑ اور اسلام میں وہ تعلق ہے جو ایک گود میں پلے ہوئے دو بچوں میں ہوتا ہے۔ پیغمبر اسلام حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی گود میں اسلام پروان چڑھ رہا تھا اور اسی گود میں حسینؑ نے پرورش پائی۔ حسینؑ نے آنکھ کھول کر اسلام کو دیکھا اور اسلام نے بڑھ کر حسینؑ کو گلے سے لگا لیا اور اسی وقت عہد و پیمان ہو گیا کہ جب اسلام پر وقت پڑے گا تو حسینؑ اس کے کام آئیں گے اور پیغمبرؐ اسلام نے اس معاہدہ کی توثیق کر دی اسلام کے اس روحانی جہاد میں جو مباہلہ کے نام سے ہوا تھا اس کم سنی کے عالم میں حسینؑ کو اپنی گود میں لا کر اور اس طرح گویا اسلام کا ہاتھ حسینؑ کے ہاتھ میں دے دیا کہ دیکھو آج میں موجود ہوں۔ میں تم کو اسلام کی نصرت کے لئے اپنے ساتھ لے گیا۔ کل کو جب میں نہ ہوں اور میرے اسلام پر وقت پڑے تو نصرت اسلام کے لئے یونہی چل کھڑے ہونا۔

وہ وقت ۶۰ھ میں آیا اور حسینؑ اسی طرح اسلام کو بچانے کے لئے نکل کھڑے ہوئے جس طرح انھوں نے اپنے جد بزرگوار کو نکلتے دیکھا تھا۔

پھر حسینؑ اور اسلام کے باہمی تعلق کے لئے یہ الفاظ بھی میں کہہ سکتا ہوں کہ ان میں وہ تعلق ہے جو لفظ اور معنی میں، متن اور شرح میں، اجمال اور تفصیل میں، قرآن اور اس کی تفسیر میں، انسان اور اس کی تصویر میں ہوتا ہے۔

اسلام کچھ عقائد و اعمال کا مجموعہ ہے اور حسینؑ کی پوری زندگی ان عقائد و اعمال کا مجسم نمونہ تھی اور حضرت امام حسینؑ کا بیعت یزید سے انکار بھی اسلام کی تفسیر ہی تھا۔

اسلام کے دو معنی ہیں: ایک خدا کے سامنے سر جھکانا دوسرے اپنے کو اللہ کے بالکل سپرد کر دینا۔ اب جو خدا کے سامنے سر جھکا چکا ہے وہ یزید ایسے شخص کے سامنے سر کہاں جھکا سکتا ہے اور جو اپنے کو اللہ کے سپرد کئے ہوئے ہو وہ یزید کی بیعت کیونکر کر سکتا ہے؟

اسلام کا خصوصی پیغام بندگان الٰہی کو توحید کا پیغام تھا۔ کلمۂ لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ کا زبان ہی سے نہیں بلکہ اپنے سراپائے وجود سے اظہار واعلان ہی حقیقت اسلام ہے۔ یہ لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ کا پیغام فقط اُن لات وہُبل پر تیشہ رانی نہیں کرتا جو پتھروں سے تراشے ہوئے طاق کعبہ میں نصب تھے۔ بلکہ یہ پیغام ہر طاغوت باطل کے جلال وجبروت کو ختم کر دینے کا اعلان ہے۔ ہر اس شخص کے اقتدار کو ختم کر دینے کی منادی ہے جو اللہ کے مقابل میں اپنے سامنے بندگان الٰہی سے سر جھکانے کا مطالبہ کرتا ہو۔ یزید اپنے وقت میں ایک ایسا ہی طاغوت تھا جو مجسمہ حق یعنی حسینؑ سے بیعت کا طلبگار تھا اور یہ حسینؑ کا کلمہ لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ کے تقاضوں پر سختی سے قیام تھا جو انھوں نے یزید کی بیعت سے انکار کیا اسی لئے تو خواجہ غریب نواز کو کہنا پڑا:

شاہ است حسینؑ بادشاہ است حسینؑ
دین است حسینؑ دیں پناہ است حسینؑ
سر داد نداد دست در دست یزید
حقا کہ بنائے لاالہ است حسینؑ

اور ڈاکٹر اقبالؔ نے کہا:

بہر حق در خاک وخون غلطیدہ است
پس بنائے لا الہ گردیدہ است

کربلا میں حضرت امام حسینؑ نے اسلام کی راہ میں جو قربانی پیش کی وہ ہمہ گیری کے اعتبار سے تاریخ عالم میں بے نظیر ہے اس لئے کہ راہ حق میں ہمیشہ جو قربانیاں پیش ہوتی رہیں وہ عموماً شخصی اور انفرادی تھیں مگر یہ کربلا کی قربانی ہی کی خصوصیت تھی اس میں امام عالی مقام نے اپنے بھائیوں، بھتیجوں، بھانجوں، یہاں تک کہ اپنے کڑیل جوان علی اکبرؑ اور اپنے شیر خوار علی اصغرؑ ہر ایک کو اپنی آنکھوں کے سامنے بلکہ اپنے ہاتھ سے راہ خدا میں نثار کیا اور اس سے بڑھ کر اپنے اہل حرم کی اسیری تک گوارا کر لی اور اس طرح یہ ثابت کر دیا کہ اسلام سے کوئی شے عزیز نہیں۔

پھر یہ کہ اس ہنگامہ مصائب وآلام اور طوفان شدائد ومظالم میں شریعت اسلام کی ہر تعلیم کو بھی محفوظ رکھا اور ایسے نازک لمحات میں ان کی مثال پیش کی جن میں عام انسان کے تو ہوش وحواس بھی بجا نہیں رہ سکتے۔

ایک طرف خالق کی نماز بجماعت ادا کی اس وقت جب تیروں کی بارش ہو رہی تھی مگر دو فدا کار سعید بن عبداللہ حنفی اور زہیر بن قین سامنے کھڑے کر دیئے کہ وہ تیروں کو اپنے اوپر روکیں۔ ادھر امام نے سلام پھیرا اور ادھر سعید زخموں سے چور زمین پر گرے اور امام سے مخاطب ہوکر پوچھا اوفیت یا اباعبداللہ کیوں مولا میں نے حق وفا ادا کیا ہے امام نے فرمایا نَعَمْ وَفَیْتَ جَزَاکَ اللّٰہُ خَیْرًا ''ہاں ہاں تم نے حق وفا ادا کر دیا اللہ تمہیں جزائے خیر عطا کرے''۔

دوسری طرف حقوق العباد جن کی اسلام میں بڑی اہمیت ہے، انھیں بھی سخت سے سخت اوقات میں حضرت امام حسینؑ نے ادا کیا۔ کربلا کے راستے میں فوج حر کو پانی پلانا کیا تھا...... حالانکہ وہ دشمنوں کی فوج تھی مگر چونکہ پیاسی تھی رحمۃ للعالمین کے جانشین سے دیکھا نہ گیا...... حالانکہ اپنے ساتھ اہل حرم اور چھوٹے چھوٹے بچے بھی تھے اور عرب کے بے آب وگیاہ صحرا کا مستقبل آگے تھا مگر آپ نے اپنے ساتھ کا جتنا پانی تھا وہ اس فوج کو پلوا دیا یہاں تک کہ ان کے گھوڑوں تک کو سیراب کر دیا۔

روز عاشور جب کہ جدال وقتال کا بازار گرم تھا۔ تین دن کی بھوک پیاس تھی اور عرب کے صحرا کی دھوپ سر پر تھی......

اس وقت اپنے ساتھ والوں کے ساتھ وہ مساویانہ سلوک کہ خیمہ گاہ سے معرکۂ جنگ میں ہر ایک ساتھی کے گھوڑے سے گرنے پر امام سرہانے پہنچتے تھے اور لاش اٹھوا کر خیمہ گاہ کی طرف لے جاتے تھے۔

وہ اسلامی مساوات کی ہمہ گیری جس میں غلاموں تک سے عزیزوں کا برتاؤ کیا جاتا ہے کربلا میں اپنی پوری شان کے ساتھ برتی گئی واضح غلام ترکی اور جون غلام حبشی کے ساتھ اس برتاؤ سے جو امام نے کیا بلکہ غلام کے ساتھ جو برتاؤ کیا وہ دوسرے اصحاب اور اپنے اعزاء کے ساتھ نہ کیا کہ جب وہ زخمی ہوکر گرا اور اس کی آواز پر امام تشریف لے گئے تو آپ اس کے سرہانے بیٹھ گئے اور اپنا مقدس ومطہر رخسار اس کے رخسار پر رکھ دیا اور اسی طرح رہنے دیا یہاں تک کہ اسی عالم میں اس کی روح نے جسد سے مفارقت کی .... اور اس مساوات کو اس سے بھی زیادہ سخت موقع پر اس وقت نباہا جب اصحاب کی شہادت کے بعد بلکہ اعزاء کے داغ اُٹھانے کے بعد بلکہ اس وقت جب علی اکبرؑ کو دم توڑتے دیکھ چکے تھے۔ جب عباسؑ کمر شکستہ کر چکے تھے بلکہ اس عالم میں جب ابھی ابھی اپنی تلوار سے قبر کھود کر اپنے ہاتھوں سے چھ مہینے کے شیرخوار علی اصغرؑ کو دفن کر چکے تھے۔ اس وقت جب رخصت آخر کے لئے در خیمہ پر آئے اور بلند آواز سے کہا: **السلام علیک یا زینب السلام علیک یا امّ کلثوم السلام علیک یا لیلیٰ ورباب السلام علیک یا سکینۃ ورقیۃ وان البنون۔** بی بیوں اور بیٹیوں کے سلام کے ساتھ ساتھ یہ بھی کہا کہ **السلام علیک یا فضۃ جاریۃ امّی فاطمۃ الزھراء** سلام ہو فضہ پر جو میری ماں فاطمہ زہراؑ کی کنیز ہے"۔

اس طرح حسینی کردار میں تعلیماتِ اسلامیہ اس صورت پر منسلک ہوگئے ہیں کہ حسینی یادگار کے ساتھ ساتھ مسلمانوں کو اسلامی تعلیمات کی یاد بھی تازہ ہوتی رہتی ہے۔

اس طرح حسینؑ اور اسلام دونوں ہی ایک ساتھ زندہ ہیں اور ہمیشہ زندہ رہیں گے۔

حضرت امام حسین علیہ السلام نے مشیروں کا کہنا کیوں نہیں مانا؟

اگر واقعۂ کربلا نہ ہوتا تو کیا ہوتا؟

(وہ معرکہ آرا تقریر جو ۱۰/اپریل ۱۹۵۵ء کو صبح ساڑھے دس بجے سے گیارہ بج کر ۵۵ منٹ تک لاہور کے عظیم الشان اجلاس "حسین ڈے" میں ہوئی)

۱۳۶۱ھ کے بین الاقوامی اجتماعات کے بعد جو ہر ہر شہر اور ہر ہر قصبہ، ہر ہر دیہات میں منعقد ہوئے تھے اور جن میں سے ہر اجتماع میں قوم ومذہب کے افراد شریک ہوئے تھے کم ازکم میرے لئے اور میرے ان رفقائے کار کے لئے جو دہلی یا لکھنؤ سے آئے ہیں یا اس زمانہ میں وہاں کے باشندہ تھے لاہور کا یہ مظاہرۂ حسینیت کوئی حیرت خیز یا غیر معمولی موقف نہیں۔ مگر یاد رکھئے کہ جتنا مرض شدید ہوتا ہے دوا کی تاثیر اسی قدر زیادہ نمایاں ہوتی ہے وہ ۱۳۶۱ھ تھا اور آج ۱۳۷۴ھ ہے اس مدت میں حالات میں زمین وآسمان کا فرق ہوگیا۔ اس درمیان میں جو زلزلے، آندھیاں اور سیلاب آئے جنھوں نے زمین وآسمان کو بدل دیا ہے ان حالات میں یقیناً لاہور کا جلسہ خاص اہمیت رکھتا ہے اور ایک قسم کا نیا تجربہ ہے جو نوع انسانی کے سامنے پیش ہوا ہے۔

۱۳۶۱ھ میں دلوں کے آبگینوں میں بال پڑے تھے مگر ان کے پرخچے نہ اُڑے تھے اور خراشیں آئیں تھیں مگر گھاؤ نہ ہوئے تھے۔ ہمارے رجحانات کی سمتیں الگ الگ ہوئی تھیں

لیکن جسم جدا جدا نہ ہوئے تھے مگر ۱۳۷۴ھ میں جب کہ لاہور میں آج یہ عظیم الشان اجتماع ہوا ہے وہ وقت ہے کہ جب حالات نے ایسا عظیم تفرقہ ڈال دیا کہ ملک کا کیا ذکر گھرانے اور گھر تقسیم ہوگئے۔ اکثر بھائی سے بھائی، باپ سے بیٹا، شوہر سے بیوی، بہن سے بھائی کی جدائی ہوگئی۔ اس دور میں حسینیت کا یہ عجیب تجربہ ہے جو نوع انسانی کے سامنے پیش ہورہا ہے اور یہ ثابت کررہا ہے کہ گونا گوں انقلابات کے باوجود جب حسینیت کا پرچم کھل جاتا ہے تو مذاہب کا فرق اور اقوام وممالک کا امتیاز مٹ جاتا ہے اور ہندوستان اور پاکستان ایک ہوجاتے ہیں۔

۱۳۶۱ھ سے زیادہ آج کا یہ تجربہ کارگر اور مفید ہے اس لئے کہ اس وقت ہم ایک ایسے نظام کے ماتحت گرفتار تھے کہ تمدن عالم میں ہماری آواز اثر نہ رکھتی تھی اور عالم کے بین الاقوامی مجالس میں آواز بلند کرنے سے ہم گھبراتے بلکہ شرماتے تھے مگر اب جب کہ ہم آزاد ہوچکے ہیں تو ہم یہ حق رکھتے ہیں کہ بین الاقوامی عالم میں اپنے اس پیغام کو پہنچا سکیں۔

آج ہم اپنے اپنے ملک میں آزاد ہوچکے ہیں اور ہم میں سے ہر ایک اپنے اپنے وسائل کا خود مالک ہے۔ اقوام عالم میں کم از کم آئینی طور پر دوسروں کے ساتھ عالمی مسائل کے حل کے لئے ہم برابر سے بیٹھتے ہیں بلکہ بعض جگہ ہم ثالث بن کر مسائل کو بھی حل کرتے ہیں اور دنیا ہمارے سامنے اپنے مسائل پیش کرتی ہے تو یہ جلسہ ایک تجربہ گاہ ہے۔ اس کی کامیابی کے بعد میں اس مستقبل کو دیکھتا ہوں جب کہ پاکستان او رہندوستان دونوں کے اکابر علماء حسینیت کے زیر سایہ عالمی مسائل کو طے کریں اور شاید آگے چل کر وہ حالات پیدا ہوں کہ حسین ڈے کا یہ جلسہ عالم کے کسی اور بڑے مرکز میں منعقد کیا جائے خواہ امریکہ میں خواہ یورپ میں اور خواہ روس وغیرہ میں اور پھر اس حسینیت کے مرکز سے بین الاقوامی دکھ درد کا علاج کیا جائے۔

یاد رکھئے کہ آج کوئی تاجدار، فاتح ممالک ایسا تصور نہیں کیا جاسکتا جس کا نام اقوام وملل کو گلے ملا دے چاہے وہ کتنے ہی جاہ وجلال کا مالک ہو مگر کربلا کے تڑپتے ہوئے لاشے بہتا ہوا خون اور نیزوں پر بلند ہونے والے سر آج دنیا کو ایک موقف پر لے آسکتے ہیں سمجھے آپ نظام اہلبیتؑ؟

دنیا نے فتح ممالک کو کامیابی کی دلیل سمجھا لیکن اہلبیتؑ نے فتح قلوب کو اصل فتح کی دلیل سمجھا۔ فاتحین ممالک ختم ہوگئے لیکن فاتحین قلوب اسی طرح زندہ ہیں۔

یاد رکھئے کہ یہ فتح کا راز وہ تھا جسے حسینؑ کے مشیر کار سمجھے ہوئے نہ تھے لیکن حضرت امام حسینؑ اس راز سے واقف تھے۔ مشیروں نے حضرت امام حسینؑ کو رائے دی کہ آپ کربلا نہ جایئے مگر امام نے مشیروں کا کہنا نہ مانا تو کیا یہ برا کیا؟ پیغمبرؐ اسلام نے اپنے مشیروں کا کہنا کب مانا تھا۔ کسی اور کا کیا ذکر۔ سگے چچا کا کہنا نہ مانا۔

یہ مشیران امام مادی مستقبل سامنے رکھتے تھے اور آج کے مشیروں کا حوالہ دینے والے بھی وہی دماغ رکھتے ہیں بیشک وہ محدود نگاہ کی رو سے مرگئے، مٹ گئے، برباد ہوگئے۔ گود کے بچے تک شہید ہوگئے عورتیں اسیر ہوگئیں یہ سب مشیروں کا کہنا نہ مان کر ہوا مگر پیغمبرؐ اسلام نے بھی تو مشیروں کا کہنا نہ مان کر دکھ ہی اٹھائے۔

یہ نہ دیکھئے کہ ۱۳/برس کے بعد ہجرت ہوئی اور انصار ملے لیکن ہجرت سے پہلے ۱۳/برس رسولؐ خدا نے کیا کیا۔ دکھ

نہیں سہے، جسم مبارک پر پتھر نہیں کھائے، سر مبارک پر خس وخاشاک نہیں پھینکا گیا؟ یہ سب کچھ ہوا۔ شعب ابی طالب میں ۳؍برس مقید رہے یہ زمانہ اتنا شدائد سے بھرا ہوا تھا کہ کئی کئی وقت نہ کھانا ملتا نہ پانی۔ اکثر درختوں کے پتے کھا کھا کر گذر کی جاتی تھی۔ انہیں تکالیف کا اثر تھا کہ محاصرہ سے باہر آنے کے بعد چند ہی ماہ کے اندر حضرت خدیجہ اور ابوطالب دونوں کی وفات ہوگئی جس کی بنا پر رسولؐ خدا نے اس سال کا نام عام الحزن رکھ دیا یہ سب کچھ کہنا نہ ماننے ہی کا نتیجہ تو ہوا۔

اب دنیا بتائے کہ انھوں نے اچھا کیا یا برا کیا اور اس کا کیا نتیجہ حاصل ہوا۔ پھر اگر پیغمبرؐ اسلام کا مشیروں کے مشوروں کو رد کر دینا درست تھا تو حضرت امام حسینؑ نے بھی اگر مشیروں کا کہنا نہ مانا تو کیا برا کیا؟

کتب تواریخ میں مشیروں کا ذکر بہت ہے مگر کسی ضعیف سے ضعیف روایت میں بھی یہ بات نہ ملے گی کہ کسی مشیر نے یہ رائے دی ہو کہ آپ یزید کی بیعت کر لیجئے۔ مشورے اس طرح کے تھے کہ عراق نہ جایئے، طائف تشریف لے جایئے، یمن چلے جایئے، مکہ معظّمہ میں قیام کیجئے لیکن کسی نے کبھی یہ نہیں کہا کہ آپ یزید کی بیعت کر لیجئے۔

اس کے یہ معنی ہوئے کہ یزید کی بیعت کرنا امام حسینؑ کے لئے سب ہی کے نزدیک ناممکن یا ناروا بات تھی۔ اب بیعت نہ کرنے کے بعد جن جگہوں کے متعلق مشورہ دیا جا رہا تھا ان میں سے کوئی بھی کیا ایسی تھی جو مملکت یزید کے حدود سے باہر ہو۔ لہٰذا نتیجہ یہی تھا کہ یزید کی طرف سے فوج کشی ہو۔ پنڈت ویاس دیو مصرا کا وہ فقرہ کس قدر پسندیدہ ہے جو آپ نے اپنی تقریر کے دوران میں کہا کہ اب سوال فقط مقتل کے انتخاب کا تھا۔ شہادت امام حسین علیہ السلام تو یقینی تھی ہی اگر مدینہ میں رہتے تو اس طرح ہوتا جیسا حضرت امام حسن علیہ السلام کے ساتھ ہوا۔ اسی طرح مکہ میں ہوتے تو بھی کسی خفیہ طریقے سے خاتمہ کر دیا جاتا۔

امام حسینؑ کا مکہ چھوڑنا کن حالات میں تھا اس کو یوں سمجھئے کہ جو دستور فطرت کے خلاف عمل ہوا اسے ضرور غیر معمولی اسباب کا نتیجہ ماننا پڑے گا۔ وہ حسینؑ جو ۲۵؍حج پا پیادہ کر چکے ہوں اور حج کے اس قدر مشتاق ہوں کہ مدینہ سے آ آ کر حج کرتے ہوں اس طرح کہ مرکب ساتھ خالی جا رہے ہوں اور آپ پیروں پر جا رہے ہوں کیا اتنے ذوق عبادت رکھنے والے حسینؑ کو مکہ سے آج وہ رابطہ نہ تھا جو مسلمانوں کو خانہ کعبہ سے ہوتا ہے ان کا تعلق کعبہ کے ساتھ مذہبی تعلق کے علاوہ خاندانی تعلق بھی تھا وہ ان کے باپ کا مولد بھی تھا۔ پھر خیال تو کیجئے کہ پیغمبر اسلام کا نواسہ اور ایک دن حج کا باقی رہتے ہوئے وہاں سے سفر کر رہا ہے جب کہ تمام مسلمان مکہ کی طرف حج کرنے جا رہے ہیں وہ وہاں سے مکہ چھوڑ کر نکل رہے ہیں اور راہ میں قافلے والے حیرت سے پوچھتے ہیں کہ امام اس وقت کدھر جا رہے ہیں۔ اور ہر شخص کا سوال فرزند رسولؐ کے دل پر نشتر کا کام کر رہا ہے۔ ہر ایک سے کہاں اصلی بات بتاتے۔ کسی کسی سے کہہ بھی دیا کہ اگر میں نکل نہ کھڑا ہوتا تو قتل ہو جاتا یا گرفتار ہو جاتا (واللہ لولم اخرج لاخضت) اس لئے کہ حاجیوں کے بھیس میں سپاہی بھیجے گئے تھے کہ جب اور جہاں امام ملیں انھیں شہید کر دیا جائے۔

ان ظالموں کے لئے جب وہ مشعر الحرام نہ تھے تو بلد الحرام اُن کے لئے حرام کہاں ہوسکتا تھا جب ان کو وقت کی حرمت کا خیال نہ تھا تو جگہ کا احترام کہاں کرتے۔

آج دنیاوی سیاست کی نظر سے اس امر کو جانچئے کہ اگر

کہیں مکہ میں طواف یا سعی کی حالت میں یا نماز میں کوئی شخص آ کر شہید کر دیتا تو فرزند رسولؐ شہید ہو جاتے لیکن آج تک دنیا کو یہ نہ معلوم ہو سکتا کہ قاتل کون ہے۔

صفحات تاریخ پر آج یہ معاملہ صاف ہے کہ حضرت امام حسینؑ بالکل بے جرم تھے اور ان کا قاتل یزید تھا لیکن اگر فرزند رسولؐ اس صورت میں شہید ہو جاتے تو قاتل امام پوشیدہ ہو کر زندہ رہتا البتہ امام حقیقی معنوں میں قتل ہو جاتے اور آپ کا مقصد بھی آپ کے ساتھ ہی قتل ہو جاتا۔

کیا مشیران امام اتنے دوررس تھے جو ان نتائج کو مدنظر رکھ کر مشورہ دیتے؟ ان میں کچھ واقعی ہمدرد تھے اور کچھ نمائشی طور پر خیر خواہ تھے جو سیاست کے ماتحت ہمدرد بن رہے تھے مگر سب کے مشورے صرف وقتی حالات کی بنا پر جذبات سے متاثر ہو کر دیئے گئے تھے۔ مگر امام حسین علیہ السلام جذبات سے بلند تر تھے کیونکہ جذبات سے بلند ہستی کا نام ہی معصوم ہے۔ اور انھوں نے مشوروں کی مخالفت کر کے اپنا جذبات سے بلند ہونا دکھا دیا اور ثابت کر دیا کہ وہ جذبات سے کسی طرح متاثر نہیں ہوتے۔

کہا جاتا ہے کہ کربلا کا واقعہ اس قدر اہمیت کیوں رکھتا ہے یا اس کو اہمیت کیوں دی جاتی ہے اگر یہ واقعہ نہ ہوتا تو کیا ہوتا؟ مگر اب جب کہ واقعۂ کربلا ہو چکا میں کیا بتاؤں کہ نہ ہوتا تو کیا ہوتا۔ جس نے تاریکی دیکھی نہ ہو اور دن ہی کو آنکھ کھولی ہو وہ پوچھے کہ سورج نہ ہوتا تو کیا ہوتا تو اسے کس طرح بتایا جا سکتا ہے۔

امام نے جو قربانی پیش کی ہم نے اس کی برکات کے زیر سایہ آنکھ کھولی ہے آپ نے حقانیت کا ایسا سورج چمکایا جو کبھی غروب ہونے والا نہیں لہٰذا اب کوئی کیا سمجھے کہ واقعۂ کربلا نہ ہوتا تو کیا ہوتا۔ یہ کہنا ایسا ہی ہے جیسا کہ کوئی کہے کہ خدا نہ ہوتا تو کیا ہوتا ظاہر ہے کہ خدا نہ ہونے کا تجربہ ہی کسی کو نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ خدا ازل سے ہے میں تو سمجھتا ہوں کہ واقعۂ کربلا نہ ہوتا تو یہ جو کچھ ہے کچھ بھی نہ ہوتا ہماری دینی زندگی جس کو دوسری لفظوں میں میں انسانی زندگی کہوں گا۔ اور شریفانہ باشعور باعزت اور خوددار زندگی اس سب کا کچھ پتہ نہ ہوتا، اذانیں نہ ہوتیں، اقامت نہ ہوتی، نماز نہ ہوتی، روزہ نہ ہوتا، حج نہ ہوتا، قرآن نہ ہوتا، اخلاق نہ ہوتا، احساس نہ ہوتا، تمدن نہ ہوتا، تہذیب نہ ہوتی مساوات واخوت نہ ہوتی، حریت نہ ہوتی جذبہ شہادت نہ ہوتا، حقانیت نہ ہوتی اور حق پرستی نہ ہوتی اب اس کے بعد میں کیا بتاؤں کہ واقعۂ کربلا نہ ہوتا تو کیا ہوتا مگر ابھی تک تو یہ دعویٰ ہی دعویٰ معلوم ہوتا ہے اس کے ثبوت کے لئے میں کہوں گا یہ دیکھئے کہ واقعۂ کربلا نہ ہوا تھا تو کیا ہو رہا تھا اور خدا کی قسم جو ہو رہا تھا وہ ایسا ہے کہ اب یقین مشکل سے آتا ہے کہ یہ ہو رہا تھا۔

جس پیغمبرؐ نے یہ نمونہ پیش کیا ہو کہ دین ودنیا کا اقتدار زیر قدم رکھتے ہوئے کئی کئی وقت پیٹ پر پتھر باندھا اور کھانا نہ کھایا ہو اور جس پیغمبرؐ نے ہمیں یہ نمونہ دکھایا ہو کہ وہ معزز بیٹی جس کی تعظیم کو آپ کھڑے ہو جاتے ہوں۔ یعنی فاطمہ زہرا سلام اللہ علیہا اپنی جگہ تو ان کا یہ اعزاز مگر جب انھیں کنیز سپرد فرماتے ہیں تو کنیز کے ساتھ مساوات کا اتنا خیال فرماتے ہیں کہ بیٹی گھر کا سارا کام کاج فضہ پر نہ ڈالنا بلکہ ایک دن گھر کا کام خود کرنا اور ایک دن فضہ سے لینا چنانچہ بیٹی نے ایسا ہی کر کے دکھا دیا کہ ایک دن فضہ لونڈی کھانا پکاتی اور کام کاج کرتی اور حضرت فاطمہؑ آرام فرماتیں اور دوسرے روز حضرت فاطمہؑ گھر کا کام کرتیں اور فضہ آرام کرتیں۔ لوگ کہتے ہیں کہ غلامی کو ختم

کیوں نہ کر دیا؟ اگر ایسا ہوتا تو معیار غلامی اپنی جگہ ہی رہتا آل رسولؐ نے بتایا کہ یہ تو باہمی تعاون کے ذریعے ہیں۔ آقا غلام خاوند بیوی وغیرہ۔ یہ رشتے گھر کے افراد میں شمول کا ذریعہ ہیں۔ ان کو ختم کرنے کی ضرورت نہیں۔ مگر ذہنیت بدلنے کی ضرورت ہے آج جب چھوٹے بھائی سے یہ سلوک روا رکھا جاتا ہے کہ کہتے ہیں ''سگ باش برادر خورد مباش'' تو ہمارے اس تمدن میں غلام کنیز کے ساتھ اچھا برتاؤ کہاں ہوگا۔ مگر یہ قصور ہمارے تمدن کا ہے آل محمدؐ کے غلاموں اور کنیزوں سے پوچھو کہ تم کو آزاد ہونا منظور ہے یا غلام رہنا۔ آج کی آزادی ہزار غلامی سے بدتر اور وہ غلامی رشک تاجداری تھی وہ فاطمہؑ زہرا کا حسب ہدایت پیغمبر برتاؤ اپنی کنیز فضہ کے ساتھ اور اسی طرح حضرت علیؑ کا برتاؤ اپنے غلام قنبر کے ساتھ اس وقت نہیں جب کہ آپ خانہ نشین تھے بلکہ اس وقت جب کہ آپ شہنشاہ تسلیم کئے جارہے تھے ایسے وقت قنبر کے ساتھ جو برتاؤ آپ نے دکھلایا کہ بازار سے دو پیراہن خریدے ایک سات درہم کا دوسرا پانچ درہم کا۔ پہلا پیراہن اپنے غلام قنبر کو حضرت نے عطا فرمایا اور پانچ درہم والا خود زیب تن کیا۔ قنبر عرض کرتے ہیں کہ حضور یہ کچھ بہتر ہے۔ آپ اسے زیب جسم فرمایئے۔ ہم میں سے آج کا کوئی آدمی اوّل تو ایسا کرتا ہی کیوں۔ اگر کوئی لیڈر قسم کا آدمی ایسا کر بھی دیتا تو جب قنبر نے عرض کیا تھا کہ حضور یہ بہتر ہے آپ پہن لیں تو فوراً اپنی مصلحانہ حیثیت کا علم اونچا کر دیتا وہ جواب میں ایک تقریر کر دیتا کہ قنبر میں دنیا سے اس تفرقہ کو ختم کرنا چاہتا ہوں میں دنیا میں غلاموں کا معیار بلند کرنا چاہتا ہوں وغیرہ وغیرہ۔

لیکن حضرت علیؑ نے یہ جواب نہیں دیا حالانکہ پیش نظر یہی تھا لیکن قنبر سے اگر یہ فرماتے تو اس جواب میں خود عدم مساوات مضمر تھی اس ارشاد سے قنبر کو احساس غلامی پیدا ہوجاتا آپ قنبر کو ایسا جواب دیتے ہیں جیسا اپنے بچوں کو دیا جاتا ہے کہ تم جوان ہو تمہیں یہ پیراہن اچھا لگتا ہے۔

پیغمبرؐ اسلام خود جس طرح کی تربیت مسلمانوں کی کرنا چاہتے تھے وہ اس واقعہ سے بھی ظاہر ہے کہ حضرت کے پاس صف میں ایک رئیس خالی جگہ پاکر بیٹھ جاتے ہیں کہ اتنے میں ایک غریب بوسیدہ کپڑوں والا جو آداب نبوی کا عادی ہے آکر اس رئیس کے پہلو میں بیٹھ جاتا ہے رئیس صاحب نے اپنے معیار طبیعت کے لحاظ سے بہت اخلاق سے کام لیا بہت ضبط سے کام لیا اپنا دربار ہوتا تو شاید یہ اس کو ڈانٹ ڈپٹ کر نکال دیتے اور بدتمیز کہہ دیتے۔

مگر وہ بارگاہ پیغمبر تھی یہاں یہ ممکن نہ تھا پھر بھی فطری طور پر ذہنیت کا مظاہرہ اس طرح ہوگیا کہ رئیس نے اپنا لباس سمیٹ لیا۔ پیغمبرؐ اسلام نے اتنا بھی گوارا نہ کیا اور خلق عظیم کی تیوریوں پر بل آگئے اور فرمایا یہ تم نے کیا کیا؟ کیا اس کی غربت تم میں آجاتی یا تمہاری ریاست اس کو مل جاتی یا چلی جاتی دامن کیوں سمیٹا؟

مربی اعظم کی اس تنبیہ کا اتنا اثر ہوا کہ وقتی طور پر اس کا ضمیر شرمندہ ہوا۔ اور عرض کی یا رسول اللہ اس گناہ کے کفارہ میں میں اپنی نصف دولت اس غریب بھائی کو دیتا ہوں۔ متبسّم ہوتے ہوئے حضور غریب کی طرف متوجہ ہوئے کہ یہ نصف دولت کی پیشکش تم کو منظور ہے؟ غریب صحابی نے جواب میں عرض کیا کہ میں اسے شکریہ کے ساتھ واپس کرتا ہوں۔ حضور نے فرمایا کہ یہ خوشی سے دے رہا ہے اس نے عرض کیا مجھے ڈر ہے کہ یہ ذہنیت کہیں مجھ میں نہ پیدا ہوجائے۔

محض اخلاق کی کتابوں میں نمائشی طور پر اصول کو درج

کر دینا آسان بات ہے لیکن جیتی جاگتی عمل کی دنیا میں اتنی کم مدت میں اس کو پیش کر دینا بڑی مشکل بات ہے۔ پیغمبرؐ خدا نے ہر تعلیم کو عمل کی صورت میں دنیا کے سامنے زندہ مجسمے کی شکل میں پیش کر دیا کہ میرا نظام فقط ذہنی یا دماغی نہیں بلکہ عملی ہے وہ زندہ نظام ہے جو سیرت و کردار کی شکل میں آنکھوں کے سامنے نمودار ہوتا ہے۔ میرا آئین اخلاق لفظی نہیں بلکہ بالکل عملی ہے۔

یہی وجہ ہے کہ کتاب اللہ کے ساتھ اہلبیتؑ کی ضرورت ہوئی اور ارشاد ہوا "اِنِی تَارِکٌ فِیکُمُ الثَّقَلَینِ کِتَابَ اللّٰہِ وَعِتْرَتِی" اور اسی لئے ان اہلبیتؑ کو مباہلہ کے میدان میں اپنے ساتھ لے گئے تھے میرا عقیدہ ہے اور میرے نزدیک ہر مسلمان کا یہی عقیدہ ہونا چاہئے کہ دعائے رسولؐ کسی کی آمین کی محتاج نہ تھی بلکہ ان میں سے ہر فرد کی دعا تنہا کافی تھی، مگر خالق اکبر نے نبی علیہ السلام کو ہدایت فرمائی کہ ان سب کو ساتھ لے جاؤ منزل مباہلہ میں۔

اس لئے کہ جب صادقین اور کاذبین میں مقابلہ ہو رہا ہے تو دنیا جان لے کہ خالص صادقین افراد یہ ہیں اور جب رسالت مآبؐ دنیا سے اُٹھ جائیں تو جو کام آپ کے بعد ان سے لیا جانا ہے وہ زندگی ہی میں ان سے لے لیا جائے۔ اس لئے فطرت اسلام کے لئے آج ان کو ساتھ لیا اور شریک کار بنایا۔ مباہلہ کے اس شریک کار ہونے میں سب سے کمسن حسینؑ تھے اور ان کو رسولؐ خود اپنی گود میں لے گئے تھے۔ پیغمبرؐ خدا کی نگاہ ماضی کے آئینے میں مستقبل کا نقشہ دیکھ رہی تھی کہ اسی حسینؑ کی قربانی کی دنیا کو ضرورت پیش آئے گی۔ چنانچہ ۶۱ھ میں وہ پیش آگئی یہ اہلبیتؑ دنیا میں اسی لئے چھوڑے گئے تھے اور ان کا تعارف مسلمانوں سے اسی لئے کرایا گیا تھا کہ یہ اسلامی نظام تمدن کی زندہ تصویر تھے کیا حیرت کی بات نہیں ہے کہ جن مسلمانوں کی تربیت اس معیار پر کی جارہی ہو۔ ان مسلمانوں میں صرف بچاس برس کے بعد ہی یہ وقت آ گیا کہ دارالحکومت اسلامی میں ریشم کے پردے لٹک رہے ہوں اور غلام زریں کمر بند لگائے ہوئے بادشاہ کے سامنے کھڑے ہوں اور دروازوں کے اوپر پہرے لگے ہوں تاکہ کسی غریب کی رسائی نہ ہو سکے اور کسی مظلوم کی فریاد اس کے کانوں میں پہنچنا ناممکن ہو جائے یہی نہیں بلکہ بادشاہ کے سامنے طلا و نقرہ کے برتنوں میں پانی پلایا جا رہا ہو۔

یہ سب باتیں یزید سے پہلے ہو چکی تھیں اور اگر کوئی صحابی مثلاً عبادہ بن صامت وغیرہ ٹوکتے بھی تھے تو ان کو قدامت پسند ہونے کی سند ملتی تھی یاد رکھئے یہی حالات ترقی کر کے یزید کے کردار کے درجہ تک پہنچے یزید سے پہلے سونے چاندی کے برتنوں میں پانی پیا گیا جو ظرف کے اعتبار سے شرع اسلامی میں حرام ہے تو یزید کے یہاں شیشوں کے جاموں میں شراب پی جانے لگی اور شراب کے دور چلنے لگے اب بجائے صدائے تکبیر کے نائے و نوش کی صدائیں بلند ہو رہی تھیں رنگ برنگ کی محفلوں میں نماز کا وقت آ کر گذر جاتا لیکن رونق محفل میں کچھ فرق نہ آتا۔

غضب یہ ہے کہ یہ سب کچھ جانشینی رسولؐ کے نام پر ہو رہا ہو اور سب مسلمان درباری وغیرہ مان رہے ہوں اور یہ ہونا اتنا حیرتناک نہیں جتنا کہ عام طور پر مسلمانوں کا ماننا یعنی یہ سب کچھ ہو رہا ہو اور مسلمان اس حاکم کو خلیفۂ رسولؐ مان رہے ہوں۔ آج کا مسلمان ضرور حیرت سے یہ پوچھے گا کہ کیا مسلمان اس کو مان رہے تھے۔

جی ہاں سب مان رہے تھے اگر سب نہ مان رہے ہوتے تو تاریخ شمار کر کے کیوں بتاتی کہ فلاں فلاں نے نہیں مانا۔ تاریخ کا شمار کرنا بتا رہا ہے کہ اور سب مان رہے تھے۔

وفات پیغمبرؐ کے پچاس برس کے بعد ہی یہ احساس مذہبی کا حال ہو چکا تھا۔ اور ۶۱ھ سے اب تک کہ تیرہ سو تیرہ برس ہو چکے ہیں مگر جب کہ عموماً احساس کیا جاتا ہے کہ اسلام گھٹتا چلا جا رہا ہے اور تمدن وتہذیب کی حدیں پامال ہو رہی ہیں مگر ۶۰ھ کے مقابلہ میں اس وقت بھی حالت بہتر ہے اور یہ مجمع کم نہیں ہے میں اسی جلسہ کے مجمع سے شہر اور دیہات سے آئے ہوئے تمام لوگوں سے پوچھتا ہوں کہ کیا ان میں سے کوئی ایک بھی یزید ایسے شخص کو جانشین رسول مان سکتا ہے؟

آج کے جاہل سے جاہل اور فاسق وفاجر مسلمان سے بھی پوچھا جائے تو یزید ایسے کسی آدمی کو جانشین رسولؐ نہ مانے گا۔ لیکن رسولؐ خدا کی وفات کے صرف پچاس برس کے بعد لوگ مان رہے تھے۔ کیا اس کے بعد بھی کسی ثبوت کی ضرورت ہے کہ واقعۂ کربلا نہ ہوتا تو کیا ہوتا؟

(چاروں طرف سے نعروں کی صدا بلند ہوئی)

ظلم اور فسق وفجور سے یہ نفرت کیونکر پیدا ہوئی۔ یہ واقعہ کربلا کا فیض ہے آج کا یہ جلسہ اور اس طرح کی تمام یادگاریں اس اثر کو زندہ رکھنے کے لئے ہیں۔ اسی کے لئے عزاداری ہوتی ہے اور اسی کے لئے نام حسینؑ کی یہ تکرار کی جاتی ہے۔

اب بھی سوال ہوگا کہ حسینؑ نے مشیروں کا کہنا کیوں نہ مانا اور یہ کہ آپ یزید کی بیعت کر لیتے تو کیا حرج تھا۔ میں کہوں گا کہ وہ حسینؑ نہ ہوتے جو مان لیتے کوئی اور ہوتا۔ حسینؑ تو کبھی پشیمان نہیں ہوئے کہ مشیروں کا کہنا کیوں نہ مانا حسینؑ کے ساتھ والا بھی کوئی پشیمان نہ ہوا۔ کوئی بچہ حسینؑ کے ساتھ کا نادم نہ ہوا۔ اور اُدھر کوئی اور کیا خود یزید ملعون نادم ہوا مگر یاد رکھئے اس فرق کو کہ وہ ندامت زندگی ضمیر کا نتیجہ نہ تھی جسے توبہ سمجھا جا سکے بلکہ وہ احساس شکست کا نتیجہ تھی اب اس خیال سے کہ میرے بعد والے مقررین پر ظلم ہوگا اور مجھے خود جلسہ کے مفاد کا بھی احساس ہے اس لئے اپنی تقریر کو اس دعا پر ختم کرتا ہوں کہ خدا کرے جس طرح آج کے جلسہ میں اجسام یکجا ہوئے ہیں۔ اسی طرح ہمارے دل ودماغ بھی یکجا ہو جائیں اور حسینیت کا جھنڈا خدا کرے برابر لہراتا رہے اور مشرق سے مغرب تک کو اپنے سائے میں لے لے۔

سلام

استاذ الاساتذہ مولانا نواب سید اصغر حسین فاخرؔ اجتہادی

غمِ حسینؑ سے جو دل میں داغ ہوتا ہے
وہ شامِ قبر میں روشن چراغ ہوتا ہے

ہوں دیدِ اکبرؑ و اصغرؑ سے شاد کیوں نہ حسینؑ
گلوں کو دیکھ کے دل باغ باغ ہوتا ہے

فروغِ داغِ جگر کیا بھلا ہو پیری میں
خموش صبح کو روشن چراغ ہوتا ہے

دیا ہے رتبۂ معراج اوجِ منبر نے
فلک پہ ذاکرِ شہؑ کا دماغ ہوتا ہے

علیؑ جو قتل ہوئے غل ہوا یہ مسجد میں
خموش خانۂ حق کا چراغ ہوتا ہے

ہو داغِ دل سے نہ کیونکر فروغِ داغِ جگر
کہ اک چراغ سے روشن چراغ ہوتا ہے

شہید کرتے ہیں تیروں سے شہؑ کو اہلِ دمشق
ہوائے شام سے گل اب چراغ ہوتا ہے

خیالِ ظلمتِ مرقد ہو کیا مجھے فاخرؔ
مثالِ بدر غمِ شہؑ کا داغ ہوتا ہے

❀❀❀